Dareecha-e-Tahqeeq

دریچۂ تحقیق

ISSN PRINT 2958-0005 ISSN Online 2790-9972

VOL 6, Issue 1

www.dareechaetahqeeq.com dareecha.tahqeeq@gmail.com

ڈاکٹر محمد اعظم

لیکچرار اردو، نیشنل یونیورسٹی اف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد

عصرِ حاضر میں اقبال کی سیاسی تفہیم

Dr. Muhammad Azam

Lecturer Urdu, National University of Modern Languages, Islamabad

Iqbal's Political Understanding In Contemporary Times

This article delves into Allama Iqbal's political philosophy and its relevance in contemporary times, exploring how his ideas offer solutions to modern socio-political challenges faced by the Muslim world. Iqbal's political thought, rooted in Islamic principles, underscores the interconnectedness of religion and politics while emphasizing the role of power, selfhood (Khudi), and collective identity (Ummah). He advocated for the revival of Ijtihad to address stagnation and foster intellectual progress in Muslim societies. The article highlights Iqbal's critique of Western political systems, such as capitalism and communism, and his advocacy for Islamic democracy as a just alternative. It also explores key concepts like Mard-e-Momin, unity of the Muslim Ummah, and the rejection of narrow nationalism in favour of a universal Islamic identity. In the context of contemporary global challenges, Iqbal's vision offers timeless insights into fostering justice, unity, and moral integrity. His ideas remain a guiding light for political, social, and economic reform in the modern era.

Keywords: Allama Iqbal, Politics, Nation, Muslims,

اقبال کے تصورات اصل میں اسلامی نظریات سے ماخوذ ہیں۔ دین اسلام ایک کامل دین ہے جو زندگی کے ہر موڑ پر نہ صرف راہ نمائی کرتا ہے بلکہ عملی مثالیں بھی پیش کرتا ہے۔ اقبال کے افکار و نظریات آفاقی ہیں۔ آپ جس پس منظر سے اقبال کی تفہیم کرنا چاہیں، افکار اقبال اسی سانچے میں بصیرت کے دروازے کھولتے نظر آتے ہیں۔ اقبال نے اسلام کے سیاسی و معاشی نظام کو مکمل طور پر تسلیم کرتے ہوئے ملت کی بقا اور استحکام کے لیے قلم کا استعمال کیا۔ خاص طور پر جب اقبال پر یہ حقیقت اشکار ہوئی کہ امت مسلمہ کے سیاسی زوال کی پہلی وجہ طاقت سے محرومی ہے۔ مسلمانوں کے زوال کی وجہ کو اقبال نے اپنے ایک شعر میں دوٹوک بیان کیا۔ آپ فرماتے ہیں:

تقدیر کے قاضی کا یہ فتویٰ ہے ازل سے

ہے جرمِ ضعیفی کی سزا مرگِ مفاجات(1)

ایک مضبوط اور مؤثر سیاسی نظام کی بقا کے لیے طاقت ایک لازمی عنصر ہے، اور اسلامی نقطہ نظر میں اسے ناپسندیدہ نہیں سمجھا جاتا۔ موجودہ دور کی صورتحال پر نظر ڈالیں تو امتِ مسلمہ کا مستقبل غیر یقینی دکھائی دیتا ہے۔ علامہ اقبال نے اپنے انگریزی مضمون "مسلم سیاست" میں مسلمانوں کے زوال کی وجوہات پر روشنی ڈالی۔ ان کے مسلسل غور و فکر سے یہ حقیقت سامنے آئی کہ امت مسلمہ اپنی عملی قوت کھو چکی ہے اور اپنے اسلاف کے کارناموں اور ان کے عزم و عمل کی روایات کو نظر انداز کر چکی ہے۔

علامہ اقبال نے امت مسلمہ کے مسائل کا گہرائی سے جائزہ لینے کے بعد اس مقصد کی طرف توجہ مرکوز کی کہ اپنی ملت میں کھوئی ہوئی عظمت اور طاقت کا شعور پیدا کریں اور اس میں نئی روح پھونکیں۔ اس مقصد کے لیے انہوں نے ایک فلسفہ وضع کیا جس کا محور ملت کی تجدیدِ حیات تھا۔ خودی، مومن، ملت، حاکمیت، اور اجتہاد جیسے فلسفیانہ تصورات، جن میں سیاسی پہلو بھی شامل تھے، اقبال کے افکار کا حصہ بنے۔ انہوں نے ان تصورات کو الفاظ کا جامہ اس لیے پہنایا تاکہ ان کے ذریعے اپنی قوم کو جرات، طاقت، عزم، اور حوصلے کا پیغام دے سکیں۔

موجودہ دور میں امت مسلمہ ان تمام عناصر سے محروم ہے جو اس کی ترقی اور استحکام کے لیے ضروری ہیں۔ اقبال کے افکار آج کے پیچیدہ مسائل میں گھرے ہوئے معاشروں کے لیے شفا کا ذریعہ بن سکتے ہیں۔ اقبال کے نزدیک طاقت اور قوت کے حصول کا تصور بے قابو نہیں ہے بلکہ محدود ہے۔ مسلم معاشرے میں حاکمیت صرف اللہ کے لیے مخصوص ہے، اور ملت اسلامیہ کو اللہ کی جماعت قرار دیا گیا ہے۔ تمام عالم وجود میں اسلام کا واحد حاکم اعلیٰ ہے، جو نہ صرف قوانین وضع کرتا ہے بلکہ نظام حیات پر مکمل اختیار بھی رکھتا ہے۔ وہی ریاست کی بقا اور استحکام کی اصل بنیاد ہے۔ ڈاکٹر پروین شوکت قران کے اس تصور کو بیان کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:

اللہ تعالیٰ مشرق و مغرب کا مالک ہے۔ تم جہاں بھی اپنی سوچ کو مڑ کر دیکھو گے، وہاں اللہ کی قدرت کے آثار نظر آئیں گے۔ اللہ پوری کائنات کو اپنی قدرت کے دائرے میں گھیرے ہوئے ہے اور ہر ذرے کا علم رکھتا ہے۔(2)

اقبال کا نظریہ حاکمیت توحید کے تصور سے گہرا تعلق رکھتا ہے اور اس سے جدا نہیں کیا جا سکتا۔ ان کے نظریے سے یہ واضح ہوتا ہے کہ اللہ کے اقتدار اور اختیار میں کوئی شریک نہیں ہو سکتا۔ حاکمیت اور توحید دراصل ایک ہی حقیقت کے دو پہلو ہیں، اور ملت اسلامیہ کی سیاست کی بنیاد اسی توحید پر قائم ہے۔ ڈاکٹر پروین شوکت اس حوالے سے لکھتی ہیں:

اقبال اس امر سے باخبر تھے کہ حاکمیت اور توحید کے ربط کی بنا پر غیر مسلم ناقدین کو یہ کہنے کا موقع ملا کہ اسلام خالص مذہبی حکومت کی تلقین کرتا ہے۔ وہ اس کی پرزور تردید کرتے ہیں کہ جلد بازی میں یہ فیصلہ کر لینا اس امر کی دلیل ہے کہ نقاد صحیح اسلامی اصولوں سے ناواقف ہیں۔(3)

اللہ کی حاکمیت کا نظریہ انسان کے نظامِ زندگی سے دین اور سیاست کی علیحدگی کے تمام امکانات کو ختم کر دیتا ہے۔ موجودہ دور میں مغربی سیاسی فکر کا سب سے اہم کارنامہ دین اور سیاست کے درمیان تفریق پیدا کرنا ہے۔ اقبال نے اپنی شاعری اور نثری تحریروں میں مذہب اور سیاست کے باہمی تعلق کو بڑی اہمیت دی۔ ان کے خیال میں مذہب اسلام افراد کی زندگی میں مکمل راہنمائی کرتا ہے۔ یہ نہ صرف انفرادی سطح بلکہ اجتماعی سطح پر بھی راہنمائی کرتا ہے۔ اقبال نے اسلامی تعلیمات کو سیاسی و سماجی ڈھانچے میں لاگو کرنے کی اہمیت پر زور دیا۔ وہ اس بات پر یقین رکھتے تھے کہ اسلامی معاشرتی و سیاسی نظام میں اصول و ضوابط کو عالمی سطح پر نافذ کیا جانا چاہیے۔ اقبال کے نزدیک وہ سیاست جو مذہبی اصولوں اور پابندیوں سے آزاد ہو، ایک شیطانی نظام ہے، اور ایسی سیاست بے لگام ہے۔ اقبال ضربِ کلیم میں لکھتے ہیں۔

میری نگاہ میں ہے یہ سیاست لادین
کنیزِ اہرمن و دوں نہاد و مردہ ضمیر
ہوئی ہے ترکِ کلیسا سے حاکمی آزاد
فرنگیوں کی سیاست ہے دیو بے زنجیر
متاعِ غیر پہ ہوتی ہے جب نظر اس کی
تو ہیں ہراول لشکر کلیسا کے سفیر(4)

اقبال عالم اسلام میں اس تصور کی مقبولیت سے نالاں تھے اور چاہتے تھے کہ اہل مغرب کی اندھی تقلید سے بچا جائے۔ اقبال نے مغربی جمہوریت، سرمایہ داری، اور سوشلسٹ نظام پر گہری تنقید کی۔ ان کا خیال تھا کہ مغربی نظاموں میں انسانیت کی فلاح کی بجائے مفاد پرستی اور استحصال کا رجحان

ہے۔انہوں نے مغربی جمہوریت کو "غلامی" کے ایک نئے روپ کے طور پر دیکھا، جہاں عوام کے جذبات کو چمکایا جاتا ہے لیکن حقیقی طاقت ہمیشہ حکمرانوں کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔انھوں نے مغربی تہذیب اور ثقافت کو گہری نظر سے دیکھا اور ان پر تبصرہ کیا۔ان کی تحریروں اور شاعری میں مغرب کی تقلید پر تنقید کی گئی ہے، اور اس کی جگہ اسلامی ثقافت و تہذیب کو اپنانے کی اہمیت پر زور دیا گیا ہے۔ آج کے دور میں اقوام اس تقلید کا خمیازہ بھگت رہی ہیں۔ ہمارے اسلامی ممالک صرف نام کے اسلامی رہ گئے ہیں۔اقبال کی فکر ہر دور میں رہنمائی فراہم کرتی ہے۔موجودہ دور میں اسلامی نظام کے لیے اس ذہنی رویے سے زیادہ خطرناک کچھ نہیں ہو سکتا کہ دین اور سیاست کو الگ کر دیا جائے۔اقبال کو مکمل یقین تھا کہ مذہبی حدود و قیود سے ازاد ہو کر جو بھی سیاسی نظام اپنایا جائے گا، وہ اہل اسلام کے لیے نقصان دہ ثابت ہو گا۔اقبال لکھتے ہیں:

دین ہاتھ سے دے کر اگر آزاد ہو ملت
ہے ایسی تجارت میں مسلمان کا خسارا(5)

حاکمیت کے سیاسی پہلوؤں کو سمجھنے کے بعد، اقبال نے امت مسلمہ کے لیے اجتہاد کے تصور کو اجاگر کیا۔اقبال ان چند بصیرت رکھنے والوں میں شامل تھے جو مذہب اور سیاست دونوں میں اجتہاد کی حمایت کرتے تھے۔ان کا ماننا تھا کہ مسلمانوں کے زوال کے اہم اسباب میں سے ایک یہ ہے کہ وہ فکر و عمل میں اجتہاد کی روح سے محروم ہو چکے ہیں۔اقبال اکثر اپنے مکاتیب میں تمام مسلم اقوام کی اخلاقی، روحانی اور سیاسی پستی پر اظہار خیال کرتے تھے اور ان کے دل میں یہ خواہش تھی کہ برصغیر کے علما دین اسلام کی امامت کا فریضہ انجام دیں۔زمانے کے حالات اور واقعات نے اقبال کو اس حقیقت کی طرف متوجہ کیا کہ اجتہاد ہی وہ ذریعہ ہے جو مسلمانوں کو فکری جمود اور تعطل سے نجات دلانے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

اقبال اسلامی سنہری دور سے متاثر تھے اور انہوں نے مسلمانوں پر زور دیا کہ وہ تحقیق اور فکری جستجو کے اس جذبے کو دوبارہ زندہ کریں جو اسلام کے ابتدائی دور کا خاصا تھا۔ان کا خیال تھا کہ اجتہاد کو اپنانے سے مسلمان اسلامی اصولوں کو جدیدیت کے تقاضوں سے ہم آہنگ کر سکتے ہیں اور انفرادیت، عقلیت اور سماجی انصاف کو فروغ دے سکتے ہیں۔اقبال کے نزدیک اجتہاد ایک متحرک اور ارتقائی عمل ہے۔اقبال کے چھٹے خطبے کا حوالہ دیتے ہوئے پروفیسر عثمان لکھتے ہیں:

اسلام کے مطابق تمام زندگی کی روحانی اصل ابدی ہے جو اپنی اظہار میں تبدیلی کرتی ہے، لہٰذا جو معاشرہ حقیقت کے ایسے تصور پر مبنی ہو، اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنی زندگی میں جمود کے تمام امکانات کو ختم کر دے۔اس کے پاس اجتماعی زندگی کو منظم کرنے کے ابدی اصول ہوں کیونکہ مسلسل تبدیلی کی اس دنیا میں ابدی قدروں سے وابستگی ہمیں استقامت بخشتی ہے۔۔۔ پچھلے پانچ سو سالوں میں اسلام پر اس وجہ سے جمود طاری ہے کہ مسلمانوں نے تبدیلی کی اہمیت کو نہیں سمجھا۔(6)

اقبال کے نزدیک اجتہاد اور مسلم دنیا کی اصلاح آپس میں جڑے ہوئے ہیں۔وہ اجتہاد کو ایک ایسا ذریعہ سمجھتے ہیں جس کے ذریعے مسلمان نہ صرف موجودہ دور کے مسائل کا حل تلاش کر سکتے ہیں بلکہ باہمی اتحاد اور سیاسی آزادی بھی حاصل کر سکتے ہیں۔لیکن اقبال اس بات سے خبردار کرتے ہیں کہ مغربی تسلط کے باعث مسلمانوں میں ایک غلامانہ ذہنیت پیدا ہو چکی ہے، جو انہیں اس طرف لے جا سکتی ہے کہ وہ بغیر سوچے سمجھے مغربی نظریات کو اجتہاد کے نام پر اسلام کا حصہ بنا لیں۔اس زمانے میں مشرقِ وسطیٰ اور ایشیا کی کئی قومیں مغربی اثرات کا شکار ہو رہی تھیں، جس پر اقبال کو تشویش تھی۔اس کو علامہ اقبال ضرب کلیم میں اس طرح بیان کرتے ہیں:

کس درجہ یہاں عام ہوئی مرگِ تخیل
ہندی بھی فرنگی کا مقلد عجمی بھی
مجھ کو تو یہی غم ہے کہ اس دور کے ہنزاد
کھو بیٹھے ہیں مشرق کا سرور ازلی بھی(7)

مغرب پسندی ایک خطرناک تقلید ہے اور اسے اجتہاد کہنا اس نظریے کی اصل حقیقت سے ناشنائی کی علامت ہے۔ اقبال نے مسلمانوں کو مغرب کی تقلید کی بجائے اپنی اصل شناخت یعنی اسلامی تعلیمات اور ثقافت کو اپنانے کا سبق دیا۔انہوں نے مسلمانوں کو اپنی "خودی" کو پہچاننے کی دعوت دی، تاکہ وہ نہ صرف اپنی دنیا میں کامیاب ہوں بلکہ ایک متوازن اور اخلاقی معاشرت کی بنیاد بھی رکھیں۔اقبال نے اسلامی معاشرت، سیاست، اور معاشیات کو جدید تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے کی ضرورت پر زور دیا۔انھوں نے مغرب کی تقلید کو مسلمانوں کی تنزلی اور کمزوری کا سبب سمجھا اور اس کے بجائے اسلامی تہذیب

وثقافت کے احیاء کی ضرورت پر زور دیا۔ان کا پیغام یہ تھا کہ مسلم دنیا کو مغربی نظاموں کی اندھی تقلید کی بجائے اپنی اصل تعلیمات اور تہذیب کو اپنے معاشرتی، سیاسی اور اقتصادی نظام میں نافذ کرنا چاہیے۔"اجتہاد" نامی نظم میں اقبال لکھتے ہیں:

حلقہ شوق میں وہ جرات اندیشہ کہاں
آہ !محکومی و تقلید و زوالِ تحقیق !
خود بدلتے نہیں قرآں کو بدل دیتے ہیں
ہوئے کس درجہ فقیہانِ حرم بے توفیق ! (8)

اقبال کے افکار میں سب سے اہم نظریہ خودی ہے اور سیاسی، سماجی، اور معاشرتی لحاظ سے بھی یہ ایک انتہائی اہم پہلو ہے۔اقبال کی سیاسی تفہیم ان کے فلسفہ خودی سے جڑی ہوئی ہے۔عام خیال یہ ہے کہ اقبال کا نظریہ خودی مسلمانوں کے معاشرتی زوال اور انحطاط کے رد عمل کے طور پر پروان چڑھا تھا، جو ان کے ذہن پر غالب تھا۔چونکہ عام طور پر خودی کو غرور اور تکبر کے معنوں میں استعمال کیا جاتا تھا، اقبال نے بار بار یہ بات واضح کی کہ وہ جس معانی میں اس لفظ کا استعمال کر رہے ہیں، وہ بالکل مختلف اور متضاد ہے۔اقبال کے نظریہ خودی میں ایک مجاہد کا عزم اور استحکام عمل شامل ہے، جو ایسی زندگی نہیں گزار سکتا جس میں خود زندگی کو نظر انداز کر دیا جائے۔اسرار خودی میں اقبال نے فکر، نظر اور کردار کی بعض اہم خصوصیات بیان کیں جو خودی کی نشو نما اور ارتقا کے لیے ضروری ہیں۔یہ امتیازی اوصاف عشق، فقرِ اللہ، جراتِ ایمانی اور اخلاقیات ہیں۔اس تصور کی تخلیق کا اصل سبب سیاسی پیچیدگیاں تھیں۔وہ ملت کے اخلاقی انحطاط اور معاشرتی عیوب کو سیاسی غلامی کا نتیجہ سمجھتے تھے۔اپنی نظم "مرگِ خودی" میں اقبال نے مشرق اور مغرب کی زبوں حالی کو زوالِ خودی کا نتیجہ قرار دیا ہے۔اقبال لکھتے ہیں:

خودی کی موت سے مغرب کا اندروں بے نور
خودی کی موت سے مشرق ہے مبتلائے جذام
خودی کی موت سے روح عرب ہے بے تب و تاب
بدن عراق و عجم کا ہے بے عروق و عظام(9)

اقبال اس حقیقت کا دعویٰ کرتے ہیں کہ صرف فکری یا خیالی مشاہدات انسانی زندگی کو عروج تک نہیں پہنچا سکتے، بلکہ متحرک قوت اور رد عمل انسانی زندگی اور مذہب کی اصل روح ہیں۔اقبال اپنے خطبے کے دیباچے میں لکھتے ہیں:

قران مجید فکر کی بجائے عمل کی ترغیب دیتا ہے، مگر عام لوگوں کی فطرت میں یہ صلاحیت نہیں ہوتی، بلکہ وہ اپنے قلبی کیفیات، جن پر ان کے ایمان کی بنیاد رکھی گئی ہے، کو اس طرح استعمال کریں کہ زندگی کے دیگر حالات یا اپنے ارد گرد کے ماحول کو اپنے اندر جذب کر لیں۔۔۔مثبت تصوف نے ماضی میں اگرچہ مذہبی یا روحانی جذبے کے فروغ میں اہم کردار ادا کیا، مگر جدید دور کے انسانی ذہن سے قطعی نا اشنا ہے۔(10)

خودی بغیر عمل اور تعبیر کی طاقت کے پروان نہیں چڑھ سکتی۔خودی کے بہت سے عناصر ہیں جو طاقت میں پنہاں ہیں۔موجودہ دور میں مسلم امہ اپنی طاقت کھو رہی ہے جس کے نتیجے میں ان کی خودی بھی مٹتی جا رہی ہے۔لہٰذا خودی میں طاقت کا جزو شامل ہونا یہ ثابت کرتا ہے کہ نظریہ خودی سیاسی اہمیت رکھتا ہے۔اقبال کا خیال ہے کہ جب تک ایک معاشرہ خودی کی بنیادوں پر قائم نہ ہو، وہ سیاسی اور اقتصادی ترقی حاصل نہیں کر سکتا۔ماضی اور آج کے دور میں اقبال کا نظریہ خودی اپنی تمام تر سیاسی اہمیت کے ساتھ افاقی طور پر مسلمہ ہے۔آج کی تیز رفتار اور گلوبل معاشرت میں یہ تصور مزید اہمیت اختیار کر گیا ہے۔موجودہ دور میں اقبال کا تصور خودی مثبت طرز پر اقوام کو مدد فراہم کرنے کی ترغیب دیتا ہے۔یہ تصور افراد اور معاشرے کو یہ یقین دلاتا ہے کہ وہ قوم کے فعال کارکن ہیں اور قوم کی تقدیر بدلنے میں اہم کردار ادا کر سکتے ہیں۔تمام افراد کی خودی جب منظم ہو کر قوم کی خودی میں تبدیل ہو جاتی ہے تو اقبال اسے "بے خودی" کا نام دیتے ہیں۔خودی کا تصور انفرادی روحانیت کے دائرے سے ماورا ہو کر اپنے اثر و رسوخ کو سیاسی میدان تک پھیلا دیتا ہے۔سیاسی تناظر میں بے خودی کو قوم کی بے لوث خدمت اور عظیم تر بھلائی کی طاقت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔یہ شہریوں کے درمیان اتحاد و یگانگت کو فروغ دیتا ہے۔

عصر حاضر کے پیچیدہ سیاسی منظر نامے میں "بے خودی" کا تصور راہنماؤں کے لیے اتحاد، سماجی انصاف اور قوم کی بھلائی کے لیے ایک راہ نما اصول کے طور پر کام کر سکتا ہے۔یہ ایک یاد دہانی ہے کہ سیاسی طاقت کو بے لوث اور عظیم جذبے کے ساتھ استعمال کیا جانا چاہیے۔

اقبال کی سیاسی تفہیم اس وقت تک مکمل نہیں ہو سکتی جب تک "مردِ مومن" یا "انسانِ کامل" کے نظریے کو بیان نہ کیا جائے۔ فکرِ اقبال کا یہ اہم موضوع ہے۔ سیاسی تناظر میں اقبال کا "مردِ مومن" کا تصور ان کے فلسفے کا کلیدی پہلو ہے۔ اقبال کا مردِ مومن روحانی طور پر بیدار ہے، جس کی جڑیں اسلامی اصولوں اور اقدار سے جڑی ہوئی ہیں۔ اس کے اوصاف قوت، بصیرت، عمل اور فراست ہیں۔ یہی صفات دراصل سیرتِ رسولؐ میں بھی موجود تھیں۔ اپ کی سیرت وسنت کو راہ عمل بنا کر ایک مومن اپنی تقدیر کو خود بدل سکتا ہے۔ ڈاکٹر عبدالمعینی اقبال کے مردِ مومن کے بارے میں لکھتے ہیں:

وہ مجسمہ خودی ہے۔ عرفانِ نفس کا علم رکھتا ہے۔ اپنی شخصیت کے مسلسل ارتقا میں مگن ہے۔ پوری کائنات اس کے ارتقائی کوششوں کی جولانگاہ ہے۔ وہ زمان و مکان کی حدود سے بالاتر ہے۔ وہ اپنی حقیقت کا ادراک ایمان بالغیب سے کرتا ہے، جو محبتِ الٰہی کا تقاضا ہے۔ وہ دیدارِ الٰہی سے سرشار ہے۔ اس کی نماز اس طرح ہے کہ وہ خدا کو دیکھ رہا ہے اور خدا اسے۔ اس کی تمام کوششوں کا مقصد قربِ الٰہی کا حصول عطا کرتا ہے۔(11)

بہت سے ناقدین کا خیال ہے کہ اقبال کا تصور "مردِ مومن" نیٹشے کے "سپرمین" سے مستعار لیا گیا ہے اور دونوں میں مشابہت ہے۔ اگرچہ کسی حد تک اقبال نیٹشے کے خیالات سے متاثر تھے، لیکن حصولِ طاقت کا تصور نیٹشے اور اقبال کے نظریات میں مشترک ہے۔ تاہم، اقبال کے لیے طاقت کا نظریہ قران پر مبنی ہے۔ دونوں فلسفیوں کے نظریات طاقت کے حصول کے حوالے سے متضاد ہیں، کیونکہ نیٹشے خدا کا انکاری ہے۔

عصر حاضر میں اقبال کا "مردِ مومن" کا تصور گہری سیاسی اہمیت رکھتا ہے۔ ہنگامہ آرائی اور تصادم کے دور میں یہ تصور امید کی کرن ہے جو عالمی سیاسی سٹیج پر امن، انصاف اور ترقی کے لیے ایک مثال قائم کر سکتا ہے، کیونکہ اقبال کا مردِ مومن محض مذہبی تقویٰ تک محدود نہیں بلکہ وہ اٹل ایمان، اخلاقی دیانت اور انصاف کا حامل ہے، جو متحد قوت کے طور پر مذہبی تنوع کی حامل دنیا میں اتحاد کی علامت ہے۔ عصر حاضر میں بین المذاہب ہم اہنگی کی کمی ہے، لیکن اقبال کا مردِ مومن رواداری اور بقائے باہمی کی ایک مثال قائم کر سکتا ہے۔ موجودہ دور کی سیاست اخلاقی دیانت سے محروم ہے اور مسلم امہ وطنیت کی جغرافیائی حدود میں بٹ چکی ہے۔ اقبال کا مردِ مومن سرحدی حدود سے بالاتر ہو کر بین المسلمین اتحاد کا محرک بن سکتا ہے۔ انصاف اور اخلاقی سالمیت کے لیے مومن کا عزم سفارتی مذاکرات کی راہ ہموار کر سکتا ہے۔ اقبال کا مردِ مومن مثبت سماجی تبدیلی کا محرک ہے اور ماحولیاتی انحطاط، سماجی ناانصافی اور معاشی عدم استحکام کے دور میں اہم عالمی مسائل حل کرنے میں قائد کا کردار ادا کر سکتا ہے۔ عصر حاضر میں مردِ مومن کا تصور سیاسی اہمیت کا حامل ہے۔ اقبال نے مردِ مومن کی خصوصیات کو اس شعر میں نہایت جامعیت کے ساتھ بیان کیا ہے:

کوئی اندازہ کر سکتا ہے اس کے زورِ بازو کا
نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں (12)

مردِ مومن کے بعد اقبال کا نظریہ "ملت" انتہائی اہمیت کا حامل ہے۔ نسلی، نسبی اور علاقائی امتیازات سے بالاتر مسلمان جماعت کو اقبال نے "ملت" کا نام دیا۔ اقبال کا عقیدہ ہے کہ ملتِ اسلامیہ کی ہمہ گیری رنگ و نسل اور وطنیت کی قیود سے ماوراء ہے، اور ملت کی اساس توحید اور رسالت کے مشترک عقائد پر مشتمل ہے۔ مختلف نسلوں سے تعلق رکھنے والے افراد عقیدہ توحید اور رسالت کی بنیاد پر اقوامِ عالم میں جداگانہ حیثیت رکھتے ہیں۔ اقبال نے بارہا امتِ مسلمہ کو دنیا کی بہترین قوم قرار دیا اور اس کی سب سے بڑی دلیل یہ پیش کی کہ ملتِ اسلامیہ نے وسیع ترین اخوت کا تصور پیش کیا، جو کسی اور گروہ نے متعارف نہیں کرایا۔ اسلام کی حدود نہایت وسیع ہیں اور اس کی ماہیت لامحدود ہے۔ اقبال نے اپنے مضمون "ملتِ بیضا پر ایک عمرانی نظر" میں ملتِ اسلامیہ کی ترکیبی ساخت پر تفصیل سے روشنی ڈالی۔

اقبال نے مذہب کو قومی زندگی کا بنیادی ستون قرار دیا ہے۔ ان کے نزدیک اسلام صرف عبادات کا مجموعہ نہیں، بلکہ ایک مکمل معاشرتی نظام ہے جس میں ملت کا تصور مرکزی حیثیت رکھتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ جب تک مسلمان اسلامی اصولوں سے پوری طرح واقف اور وابستہ نہ ہوں، ان کی قومی شناخت مکمل نہیں ہو سکتی۔ جس طرح انگریز اپنے وطن انگلستان سے اور جرمن اپنے جرمنی سے جڑے ہوئے ہیں، اسی طرح مسلمانوں کا اصل رشتہ اسلام سے ہے۔ جب مسلمانوں نے دین کی اقدار اور روایات سے روگردانی کی، تو ان کی وحدت ٹوٹ گئی اور وہ منتشر ہو گئے۔ اقبال کا نظریۂ ملت محض ماضی کی بات نہیں، بلکہ آج کی دنیا میں بھی اس کی معنویت قائم ہے۔ جب مختلف تہذیبوں اور عقائد کا باہمی تصادم روز کا معمول بن چکا ہے، اقبال کا پیغام ہمیں باہمی احترام، ہم آہنگی اور روحانیت کی بنیاد پر ایک عادلانہ معاشرہ قائم کرنے کا راستہ دکھاتا ہے۔ آج کے مادی دور میں جہاں روحانی اقدار پس منظر میں چلی گئی ہیں، اقبال کی سوچ ہمیں دوبارہ روحانی ترقی کی جانب گامزن ہونے کی ترغیب دیتی ہے۔

اقبال کا تصور ملت ایک لازوال اور قابل عمل نظریہ ہے جو آج دنیا کو درپیش بہت سے چیلنجوں کا حل پیش کرتا ہے۔ اقبال نے ہمیشہ اسلام کو سیاست کی بنیاد بتایا ہے۔ ملتِ اسلامیہ کی بقا اور سربلندی کے لیے اسلام کے سنہری اصول راہنمائی فراہم کرتے ہیں، جو ملت اپنے فکر و عمل کی صلاحیتوں کو خدا کے عطا کردہ حکم کے مطابق بروئے کار لائے گی۔ وہ یقیناً عظمت اور قوت کا پیکر ہو گی جو سیاست قران اور حق پرستی کی بنیادوں پر استوار ہو گی، اور اس ملت کے ایوان ہمیشہ مستحکم بنیادوں پر قائم رہیں گے۔

اقبال کے سیاسی نظریات میں قومیت کا تصور خاص اہمیت رکھتا ہے۔ یہ ایک ایسا نظریہ ہے جس میں فکری تضاد کا رنگ شامل ہے۔ اقبال نے یورپ جانے سے پہلے ہندی قومیت پر مبنی نظمیں لکھیں جیسے ہمالہ، ترانہ ہندی اور نیا شوالہ وغیرہ۔ محکوم وطن کی نوحہ خوانی میں وہ خود بھی روئے اور اہلِ وطن کو بھی رلایا، مگر 1905ء سے 1908ء تک کا وقت یورپ میں گزارنے کے بعد جب اقبال وطن واپس آتے ہیں، تو ان کا جذبہ حب الوطنی مسلم قومیت میں بدل جاتا ہے اور وہ یکدم نظریہ وطنیت اور قومیت پر تنقید کے نشتر چلاتے ہیں۔ کیونکہ اقبال نے یورپ میں قیام کے دوران اہلِ مغرب کی انسان سوز سرگرمیوں کو اپنی تنقیدی نظروں سے دیکھا اور ان سرگرمیوں کو عالم انسانیت کے لیے مہلک ترین اور تباہ کن قرار دیا۔

عصرِ حاضر کے حوالے سے دیکھا جائے تو اقبال کا قومیت کا تصور متضاد نہیں بلکہ متحرک اور ارتقاپذیر تصور تھا جو جدید دنیا کے سیاسی اور سماجی مسائل سے متعلق تھا۔ اقبال کا عقیدہ ہے کہ ملتِ اسلامیہ کا سیاسی رویہ نظری اور عملی دونوں صورتوں میں مغربی اقوام سے جداگانہ ہے اور ہمیشہ جدائی رہنی چاہیے۔ بانگ درا میں اس خیال کو شعری صورت میں یوں بیان کیا ہے:

ان کی جمعیت کا ملک و نسب پر انحصار
قوتِ مذہب سے مستحکم ہے جمعیت تری
دامنِ دیں ہاتھ سے چھوٹا تو جمعیت کہاں
اور جمعیت ہوئی رخصت تو ملت بھی گئی(13)

اقبال کی بصیرت نے یہ پہچان لیا تھا کہ عصر حاضر کے انسان کے ذہن و ضمیر پر قومیت کا اثر اتنا گہرا ہو چکا ہے کہ یہ دیوی و دیوتا کی طرح اس کی ذہنی پرستش بن گئی ہے اور مذہبی صداقت کے لیے بقا اور حیات کے امکانات کم ہوتے جا رہے ہیں۔ اقبال لکھتے ہیں:

ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے
جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے(14)

اگرچہ اقبال عالمی مسلم قومیت کے حامی تھے، لیکن انہوں نے ہندوستان میں مسلمانوں کی جداگانہ قومیت کی ضرورت کو بھی محسوس کیا۔ ان کے نزدیک ہندوستان میں مسلمانوں کا ایک الگ ثقافتی، مذہبی اور سیاسی تشخص تھا اور انہیں ایک علیحدہ سیاسی شناخت کی ضرورت تھی تاکہ وہ اپنی مذہبی ازادی اور ثقافتی ورثے کا تحفظ کر سکیں۔ یہی وجہ ہے کہ اقبال نے پاکستان کے قیام کے تصور کو پیش کیا، تاکہ ہندوستان کے مسلمانوں کو اپنے دین اور ثقافت کے مطابق ازاد اور محفوظ زندگی گزارنے کا موقع مل سکے۔ مسئلہ قومیت پر اقبال نے اپنی زندگی کے اخری ایام میں مولانا حسین احمد مدنی جیسے جید عالم سے اختلاف رائے کیا اور علمی و منطقی بنیادوں پر اپنا نظریہ واضح کیا۔

عصرِ حاضر میں قومیت کا تصور امت مسلمہ کے لیے انمول بصیرت پیش کرتا ہے، جس میں اتحاد، اخلاقی طرز، سماجی و اقتصادی ترقی اور عالمی برادری کے ساتھ فعال ربط شامل ہے۔ اقبال کی سیاسی تفہیم میں پین اسلامزم کا ذکر بھی نہایت ضروری ہے۔ اقبال اتحاد عالم اسلامی تحریک سے گہرا ذہنی ربط رکھتے تھے۔ انہوں نے اپنی نظم و نثر میں جمال الدین افغانی کی بہت مدح سرائی کی ہے۔ اقبال اپنے ایک مکتوب میں لکھتے ہیں:
موجودہ دور میں اگر کوئی شخص مجدد کہلانے کا مستحق ہے تو وہ صرف جمال الدین افغانی ہے۔ مصر، ایران، ترکی اور ہندوستان کے مسلمانوں کی تاریخ جب بھی لکھی جائے گی تو سب سے پہلے عبدالوہاب نجدی اور پھر جمال الدین افغانی کا ذکر کرنا ہو گا۔(15)

جاوید نامہ میں اقبال نے جمال الدین افغانی کے نقطہ نظر کو واضح کرنے کے لیے اپنی تصنیف کا ایک بڑا حصہ وقف کیا کیونکہ اقبال کے ذہن میں اسلام کا روشن مستقبل عالمگیر ملت کی صورت میں ممکن تھا۔ اقبال اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ اسلام کی عالمی اخوت سے انحراف، قرانی نظریہ حیات کے بنیادی اصولوں سے انحراف کے مترادف ہے۔ یہ امر دلچسپی کا باعث ہے کہ اقبال نے اسلام کی ہمہ گیر اخوت کی نشر و اشاعت کے لیے زبان و قلم سے مسلسل کوششیں کیں، لیکن انھوں نے "پین اسلامزم" کی مخصوص اصطلاح کی تردید کی۔ اس بات کے شواہد قاضی احمد میاں احمد کی تصنیف سے ملتے ہیں، جس میں وہ رقمطراز ہیں:

"اقبال نے اس اصطلاح کی تردید کر دی ہے۔ان کے نزدیک اس لفظ کا کوئی مفہوم نہیں"۔(16)

اقبال مسلم ممالک کے درمیان ایسے اتحاد کے پُر زور حامی تھے جو مسلمانوں کو مختلف ممالک میں رہنے کے باوجود ایک وحدت میں بدل دے۔ نظریہ قومیت سے بچا کر ملت اسلامیہ کو ہمہ گیری کی راہ پر گامزن کرنے کی وجہ یہ تھی کہ اقبال کی بصیرت نے یہ پیش گوئی کی تھی کہ یورپ کی اقوام مشرقِ وسطیٰ اور شمالی افریقہ کی مسلم ریاستوں کے خلاف سر گرم ہیں۔1908ء کے بعد اقبال کو یقین ہو گیا کہ عصر حاضر میں وطنی قومیت سم قاتل ہے، خاص طور پر اہل اسلام کے لیے جن کے دینی اصول اس کے برعکس ہیں۔ اگر پین اسلامزم کا مفہوم اتحاد بین المسلمین، انسانی معاملات میں قرانی تعلیمات کا نفاذ، اور مسلمانوں میں بے عملی اور جمود کو ختم کرنے کے لیے اجتہاد کے ذریعے غیر اسلامی رسومات کا خاتمہ ہو، تو اقبال اپنی پوری زندگی اس محاذ پر سر گرم رہے اور اپنے شعری اور نثری مجموعوں میں مسلمانوں کی راہنمائی کرتے رہے۔ عصر حاضر میں پین اسلامزم کا تصور مثبت تبدیلی کی صلاحیت رکھتا ہے جس سے امت مسلمہ عالمی معاملات میں زیادہ اہم کردار ادا کر سکتی ہے۔اختلافات سے بالاتر ہو کر عالمی چیلنجوں سے نمٹنے، دقیانوسی تصورات کا مقابلہ کر کے اور اقتصادی تعاون کو فروغ دے کر یہ تصور ایک مضبوط اور زیادہ بااثر اسلامی دنیا کے لیے راستہ ہموار کر سکتا ہے۔

اگر سیاسی نظاموں کی بات کی جائے تو اقبال نے دو بڑے مغربی نظاموں پر تفصیلی افکار پیش کیے، جن میں جمہوریت اور اشتراکیت شامل ہیں۔ اقبال کی سیاسی تفہیم ان نظاموں پر بحث کے بغیر ادھوری ہے۔ لہٰذا جب جمہوریت پر نظر ڈالی جائے تو اقبال مغربی جمہوریت کے بڑے ناقد تھے۔ ان کے مطابق مغربی جمہوریت انگریزوں کی مکاری اور فریب کے سوا کچھ نہیں۔ انگریزوں نے اپنے نوآبادیاتی نظام کو مضبوط اور جائز قرار دینے کے لیے یہ جواز پیش کیا کہ دیگر ممالک کے معاملات میں مداخلت دراصل جمہوریت کے فروغ کی ایک کوشش ہے اور پسماندہ ممالک کی غربت کو ختم کرنے کی طرف پیش رفت ہے۔ اسی لیے علامہ اقبال جمہوریت کو قابل نفرت جانتے ہیں اور اسے دیگر سیاسی نظاموں یعنی مطلق العنان شہنشائیت، آمریت اور ملوکیت کے مماثل قرار دیا۔اس حوالے سے ڈاکٹر شیراز زیدی لکھتے ہیں:

مغربی جمہوریت دراصل ملوکیت کی ہی ایک بدلی ہوئی شکل ہے۔ جب محکوموں میں بیداری اتی ہے اور وہ حکومت میں اپنا حصہ طلب کرتے ہیں تو چالاک حکمران انھیں خوش کرنے کے لیے ایک آئین ساز مجلس بنا دیتے ہیں، لیکن انتخاب کے اصول اس طرح مرتب کیے جاتے ہیں کہ جاگیر دار اور وڈیرے ہی اس میں شامل ہو سکیں تاکہ حکومت کے مفادات میں کوئی رکاوٹ نہ آئے۔ علامہ اقبال کے نزدیک ایسی جمہوریت حکمرانوں کی ساحری ہے۔(17)

اقبال کے نزدیک جمہوریت صرف ایک حکومت کا نظام نہیں بلکہ ایک طرزِ زندگی ہے جو اسلامی نظریات کی تفہیم اور اطلاق سے ممکن ہے۔ ان کا خیال تھا کہ حقیقی جمہوریت کو انصاف، مساوات اور احتساب کے اصولوں کی پابندی کرنی چاہیے۔ ان کا تصور جمہوریت چند ایسے تصورات میں سے ہے جن میں اخرت تک استقلال و استقراء کی حالت پائی جاتی ہے۔ اقبال پختہ خیالی کے حامل تھے اور اپنے زمانے میں بھی جمہوری طرز حکومت کو اسلامی روح کے مطابق ناگزیر سمجھتے رہے۔ اقبال اسلامی نظام میں روحانی اور اخلاقی جمہوریت کی خصوصیات پاتے ہیں اور اسلامی نقطہ نظر کو ایسے عناصر کا امتزاج ثابت کرتے ہیں جو بدعنوانی اور مفاد پرستی کے عیب سے پاک ہیں۔ "اسلام کا اخلاقی و سیاسی نصب العین" اقبال کا وہ پہلا مقالہ ہے جو جمہوریت کے حوالے سے ان کے افکار کے صحیح ادراک اور تفہیم کے لیے نہایت مددگار ہے۔ اقبال لکھتے ہیں:

۔۔۔ایسی ملت کے لیے بہترین طرزِ حکومت جمہوریت ہی ہو گی جس کا مقصد یہ ہو کہ جتنا ممکن ہو، ازادی فراہم کر کے انسان کو اپنی فطرت کے تمام امکانات کو ترقی دینے کا موقع دیا جائے۔ اسلام کا سب سے اہم پہلو، بحیثیت ایک سیاسی نصب العین، جمہوریت ہے۔(18)

دیگر سیاسی افکار کی طرح اقبال نے نظریہ اشتراکیت کو سنجیدگی سے اپنی فکر کا موضوع بنایا اور ایک مخصوص نقطہ نظر قائم کیا۔ انہوں نے اشتراکیت، کارل مارکس اور سرمایہ داری کے موضوع پر نظمیں لکھیں جن میں اس نظریہ کا نہایت مدبرانہ جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ اقبال کے مطابق تمام سیاسی نظاموں کے پس پردہ معاشی عوامل ہی کارفرما ہوتے ہیں، اور ان عوامل کی بدولت ہی سرمایہ داری اور اشتراکی نظام وجود میں آتے ہیں۔

اشتراکیت سے اقبال کی دلچسپی انقلابِ روس سے شروع ہوئی۔ وہ ایک جدید اور انقلابی شاعر تھے۔ بالِ جبریل اور دیگر تصانیف میں انہوں نے اتنی پرجوش نظمیں لکھیں کہ انہیں بلا تکلف اشتراکی کہا جا سکتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود اقبال اشتراکیت کے بعض بنیادی نکات سے شدید اختلاف رکھتے تھے۔ اقبال نے یورپ میں سرمایہ داری نظام کی مکاری اور کھوکھلا پن کھلی انکھوں سے دیکھا اور اس نظام کو سخت ناپسند کیا جس میں سرمایہ دار اور مزدور کے طرزِ زندگی میں بہت فرق پایا جاتا ہے۔ اقبال مزدوروں کے ہمدرد اور غمگسار ہیں اور ہر اس طبقے کے مخالف ہیں جو انسان اور انسانیت کو نقصان پہنچائے۔ اقبال خضرِ راہ میں لکھتے ہیں:

اے کہ تجھ کو کھا گیا سرمایہ دار حیلہ گر
شاخِ آہو پر رہی صدیوں تلک تیری برات!
مکر کی چالوں سے بازی لے گیا سرمایہ دار
انتہائے سادگی سے کھا گیا مزدور مات ! (19)

اگرچہ اقبال نے سرمایہ داری نظام کو ناپسند کیااور اشتراکی نظام میں مزدوروں سے ہمدردی کو پسند کیا، مگر اس سے یہ غلط فہمی پیدا ہوئی کہ اقبال کمیونسٹ تھے۔ لیکن تحقیق نے یہ ثابت کیا کہ اقبال نے اسلام کا دم کبھی نہیں چھوڑااور بہت مدبرانہ طریقے سے اشتراکیت کے صرف ان عناصر کو قابلِ تحسین جانا جو اسلامی طرز سے ہم اہنگ تھے۔ خاص طور پر دولت کی منصفانہ تقسیم کا نظریاتی پہلو اشتراکیت سے دلچسپی کا باعث بنا۔ اگرچہ عملی طور پر اشتراکی نظام اس پر کشش نظریے کو نافذ کرنے میں ناکام رہا۔ فکر اقبال تقاضا کرتی ہے کہ معاشرے میں موجود اختلافات کو رفع کرنے کے لیے اسلام کا معاشی نظام اپنایا جائے۔ اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ نے زکوٰۃ کا نصفانہ نظام متعارف کروایا ہے۔ اقبال اس بات پر یقین رکھتے تھے کہ محض مادی وسائل حقیقی اور روحانی خوشی کا ضامن نہیں بن سکتے، بلکہ معاشی اور روحانی پہلوؤں کا بھی ہم آہنگ ہونا ضروری ہے۔ عصر حاضر میں اقبال کے سیاسی نظریات عصری مسائل سے نمٹنے کا آلہ کار بن سکتے ہیں۔

جدید دنیا عدم مساوات، ماحولیاتی مسائل، سماجی و فلاحی سہولتوں کی کمی، اخلاقی اقدار میں تنزلی، مفاد پرستی، طاقت کا بے جا استعمال اور اس طرح کے بہت سے مسائل کا سامنا کر رہی ہے، جیسا کہ اقبال اپنی نظم "عصر حاضر" میں لکھتے ہیں:

یہ پختہ افکار کہاں ڈھونڈنے جائے کوئی
اس زمانے کی ہوا رکھتی ہے ہر چیز کو خام (20)

اقبال کے سیاسی نظریات ایک صدی گزرنے کے باوجود بھی اس دور سے ہم آہنگ ہیں اور شاید آنے والا ہر زمانہ اقبال کو اپنے دور کے مطابق پائے گا، کیونکہ اقبال کے سیاسی نظریات جیسے کہ حاکمیت و قوت، اجتہاد، خودی و بے خودی، مرد مومن، ملت، قومیت، پین اسلامزم، جمہوریت اور اشتراکیت ایسے سیاسی نظریات ہیں جو عصر حاضر میں بھی اپنی افادیت اور مطابقت برقرار رکھے ہوئے ہیں۔ ان کا ہر تصور دوسرے تصور سے مربوط ہے۔ اقبال یہ تقاضا کرتے ہیں کہ ایسا مرد مومن جو اللہ کی حاکمیت کو تسلیم کرتے ہوئے قوت و طاقت کا مثبت استعمال کرے، خودی کی صفت سے متصف ہو، اجتہاد کا راستہ اختیار کر کے کامیابی و خوشحالی کی نئی راہیں دریافت کرے، شاہین کی نظر اور پرواز کا جذبہ رکھتا ہو، جغرافیائی اور نسلی تعصبات سے پاک ہو، امت مسلمہ کی امامت کا فریضہ ادا کر سکے، اور تمام دنیا کے مسلمانوں کے رہنما کی حیثیت سے بین المسلمین اتحاد کو برقرار رکھ سکے۔

عصر حاضر کے سیاسی نظام شدید بگاڑ کا شکار ہیں۔ ہر ملک اپنے سیاسی نظام میں مختلف تجربات کرتا نظر آتا ہے، جبکہ اقبال نے سو سال پہلے اسلامی جمہوری نظام متعارف کروا کر ایک کامل سیاسی نظریہ پیش کیا جو نہ تو مارکسیت سے ماخوذ ہے اور نہ ہی کسی دیگر مغربی نظام سے اخذ کیا گیا ہے۔ عصر حاضر میں اقبال کو عصری تناظر میں سمجھا جائے تو ان کے سیاسی نظریات جدید دور میں بھی اپنی تازگی برقرار رکھتے ہیں اور جدید دنیا کے مسائل حل کرنے کی مکمل صلاحیت رکھتے ہیں۔

اقبال براہ راست سیاست میں زیادہ فعال نہیں رہے، لیکن انہوں نے آل انڈیا مسلم لیگ کے پلیٹ فارم کے ذریعے مسلمانوں کی سیاسی راہنمائی کی۔ وہ قائدِ اعظم محمد علی جناح کو اپنا قائد مانتے تھے اور ان کی قیادت کے زبردست حامی تھے۔ ان کا سیاسی شعور ایک ایسی سوچ کا عکاسی کرتا ہے جو نہ صرف مسلمانوں کے سیاسی مسائل کا نہ صرف ادراک رکھتی تھی بلکہ ان کے حل کے لیے قابلِ عمل تجاویز بھی پیش کرتی تھی۔ ان کے افکار آج بھی ہمارے لیے مشعلِ راہ ہیں۔

حوالہ جات

1۔ علامہ اقبال، "کلیاتِ اقبال اردو"، اقبال اکادمی پاکستان، لاہور، 2015ء، ص487

2۔ پروین شوکت علی، ڈاکٹر، "اقبال کا فلسفہ سیاسیات"، مترجم ریاض الحق عباسی، اسد پبلی کیشنز، لاہور، ص124-125

3۔ ایضا، ص141

4۔ علامہ اقبال، "کلیاتِ اقبال اردو"، ص665

5۔ ایضا، ص714

6۔ محمد عثمان، پروفیسر، "فکر اسلامی کی تشکیلِ نو-خطبات کا ایک مطالعہ"، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، 1987ء، ص152-153

7۔ علامہ اقبال، "کلیاتِ اقبال اردو"، ص635-636

8۔ ایضا، ص534

9۔ علامہ اقبال، "ضربِ کلیم"، شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور، 1976ء، ص80

10۔ جاوید اقبال، ڈاکٹر "خطباتِ اقبال۔ تسہیل و تفہیم"، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، 2008ء، ص596

11۔ عبدالمغنی، ڈاکٹر، "اقبال کا نظریہ خودی"، بک کارنر جہلم، 2016، ص260

12۔ علامہ اقبال، "کلیاتِ اقبال اردو"، ص285

13۔ ایضا، ص277

14۔ ایضا، ص187

15۔ پروین شوکت علی، ڈاکٹر، "اقبال کا فلسفہ سیاسیات"، ص312

16۔ احمد میاں اختر، قاضی، "اقبالیات کا تنقیدی جائزہ"، اقبال اکادمی پاکستان، لاہور، 1962ء، ص142

17۔ شیراز زیدی، ڈاکٹر، "سامراجیت پر اقبال کی تنقید"، سعید پبلی کیشنز کراچی، 2015ء، ص73

18۔ علامہ اقبال، ڈاکٹر، "مقالاتِ اقبال"، مرتبہ سید عبدالواحد معینی، محمد عبداللہ قریشی، القمر انٹرپرائز اردو بازار لاہور، 2011ء، ص77

19۔ علامہ اقبال، "بانگِ درا"، شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور، 1989ء، ص262

20۔ علامہ اقبال، "کلیاتِ اقبال اردو"، ص594